توشی ہیکو ازتسو

اچھے اور برے کے لئے قرآنی الفاظ

(ترجمہ محمد خالد مسعود)

یہ مضمون ڈاکٹر توشی ہیکو از تسو کی کتاب "قرآن میں اخلاقی اصطلاحات کی ساخت" کے تیرہویں باب کا ترجمہ ہے۔ یہ باب طویل ہے' اس سے پہلے حصہ کا ترجمہ اسی مجلّے کی گذشتہ اشاعت میں پیش کیا گیا۔ اب باقی حصے کا ترجمہ پیش ہے۔

(مترجم)

اسأ

یہ فعل کا صیغہ ہے' جس کا مادہ لفظ سوٗ ہے۔ مختصراً یوں کہیے کہ یہ لفظ سیئہ کے مفہوم کو عمل اور حرکت کے طور پر بیان کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ قرآن کریم میں سیئہ سے کفر کا فعل مراد ہے جو کہ سیئہ کی مکمل مثال ہے۔ مندرجہ ذیل آیت میں اس تعلق کو بہت وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ جہاں "اسأ" کا مقابلہ عمل صالح سے کیا گیا ہے۔

"من عمل صالحا فلنفسه ومن اساء فعليها" (الجاثیه : ۱۵)

"جو شخص نیک کام کرتا ہے سو اپنے لیے اور جو برا کام کرتا ہے تو وہ اپنا ہی برا کرتا ہے۔"

اگلی آیت میں "مسیئ" (بدکار) کا مقابلہ ان لوگوں سے ہے "جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے"۔ یہ بات بجائے خود نہایت اہم ہے تاہم یہاں مسیئ کی تشبیہ ایک اندھے آدمی سے دی گئی

ہے جبکہ صالح شخص کی مثال ایک بینا سے دی گئی ہے۔ قرآن کریم میں یہ دونوں استعارے بالترتیب کافراور مومن کے لیے استعمال کئے ہوئے ہیں۔

"وما يستوى الاعمى والبصير والذين امنوا وعملوا الصلحت ولا المسيئ قليلا ما تتذكرون" (المومن:۵۸)

"اور اندھا اور بینا برابر نہیں۔ نہ ہی وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے اور برائی کرنے والے۔ تم لوگ بہت کم یاد رکھتے ہو۔"

اگلی آیت میں بہت واضح طریقے سے یہ بتایا گیا ہے کہ اساءٔ کے فعل سے کونسے اعمال مراد ہیں۔ اس آیت میں "تکذیب" کے فعل کو برائی بتایا گیا ہے جو اس بات کا ایک اور ثبوت ہے کہ "اساءٔ" کا مطلب کافروں کے طریقے سے کام کرنا ہے۔

"ثم كان عاقبه الذين اساو السوآی ان كذبوا بايت الله وكانوا بها يستهزون" (الروم:۱۰)

"پھر ایسے لوگوں کا انجام جنھوں نے برے کام کئے تھے' برا ہوا۔ اس لئے کہ انہوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا تھا اور ان کا مذاق اڑاتے تھے۔"

اب ہم فعل لازم کے صیغے کی طرف یعنی ساءٔ کی طرف آتے ہیں۔ بہت مختصر طریقے سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ معنویاتی تجزیے کے اعتبار سے یہ کوئی پیچیدہ لفظ نہیں ہے' اس صیغے کا لغوی معنی برا ہونا یا بننا' نامعروف اور قابل مذمت ہونا یا فعل کرنا ہے۔ یہ مندرجہ ذیل قسم کے بیانیہ' جملوں میں استعمال ہوتا ہے جیسے ساء ھذا مذھبا (بطور طرز زندگی یہ بہت بری بات ہے)۔ اس جملہ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بطور تاکید یہ بتایا جائے کہ کوئی چیز بری ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ قرآن کریم میں یہ لفظ پہلے معنی میں زیادہ کثرت سے استعمال ہوا ہے تاہم یہ بات حتمی طور پر نہیں کہی جاسکتی۔ ذیل میں جو چار مثالیں دی گئی ہیں' ان میں سے پہلی تین میں ساءٔ پہلے مفہوم میں اور آخری آیت دوسرے مفہوم میں استعمال کرتی ہے۔

سوٗء اور سوَء

گذشتہ صفحات میں س۔و۔ء کے مادہ کے مختلف اور مشتقات کے بارے میں تفصیلی بیان کے بعد ہم اسی مادہ کی دو باقی اشکال یعنی سوٗء اور سوَء کی طرف آتے ہیں۔ تاہم ان اشکال کی اہمیت کے باوجود ان پر تفصیلی بحث بوجھل تکرار لگے گی۔ موجودہ سیاق میں ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ ان الفاظ کی صورت اور معانی کے بارے میں چند قابل ذکر بحث نکات کا ذکر ہو جائے۔

سوٗء دراصل فعل ساء کا اسم مصدر ہے۔جیسا کہ ہم تفصیل سے بحث کر چکے ہیں اسے خصوصی طور پر ایسے لقب کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے جو مرکب اسم صفت ہو (مثلاً صاحب ہمت آدمی) جبکہ سوَء اسی مادہ سے اسم مجرد ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے مثنی (جوڑا) ہیں جو نہ صرف صورت میں بلکہ معانی میں بھی متشابہ ہوتے ہیں۔ یہ دونوں بعض اوقات تو ان دونوں میں امتیاز بے حد مشکل ہو جاتا ہے' جیسا کہ ہم ابھی دیکھیں گے۔

آیئے پہلے سوٗء کو لیتے ہیں اور اس کی بعض مخصوص مثالوں کا جائزہ لیتے ہیں۔ یہ لفظ ہمیشہ ترکیب توصیفی میں مندرجہ ذیل مثال کی طرح پر استعمال ہوتا ہے: رجل السوٗء یا رجل سوٗء جس کے لغوی ہیں: ایک برے وجود کا شخص' ایک بری طبیعت اور برے اطوار کا شخص۔

> "قالوا یمریم لقد جئت شیئا فریا یاخت ھرون ماکان ابوک امرأ سوَء وماکانت امک بغیا" (مریم :۲۷)
>
> "لوگوں نے کہا' اے مریم! تم نے تو بہت غضبناک برا کام کیا۔ اے ہارون کی بہن! تمہارے باپ کوئی برے آدمی نہیں تھے اور نہ ہی تمہاری ماں بد کار تھیں۔"

یہاں سیاق سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ سؤء سے مراد بدکاری یا جنسی آوارگی ہے۔ اسی طرح سورہ انبیاءٗ آیت ۷۴ میں سدوم کے لوگوں کو ان کی قابل مذمت عادات کی وجہ سے قوم سؤء (برے کردارے کے لوگ' برے لوگ) کہا گیا۔

ایک اور درجے میں جسے دینی کہنا زیادہ صحیح ہو گا' حضرت نوحؑ کی قوم کے بارے میں یہی الفاظ (قوم سؤء) استعمال ہوئے ہیں' ان کے برے وجود یا برائی کی وجہ سے یہ مرتبہ تکذیب ہے۔

"ونصرنه من القوم الذين كذبوا بايتنا انهم كانوا قوم سوء فاغرقنهم اجمعين" (الانبياء: ۷۷)

"اور ہم نے اس (حضرت نوحؑ) کی ایسے لوگوں کے خلاف مدد کی جو ہماری آیات کو جھٹلاتے تھے' بے شک وہ برے لوگ تھے' ہم نے ان سب کو غرق کر دیا۔"

اگلی آیات میں چند بدوی قبائل کی طرف اشارہ ہے جو حدیبیہ کی مہم کے موقع پر کسی نہ کسی بہانے کوشش کرتے ہیں کہ جہاد کے فرض سے جان چھڑالیں اور اس میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

"بل ظننتم ان لن ينقلب الرسول والمومنون الى اهليهم ابدا وزين ذلك فى قلوبكم وظننتم ظن السوء وكنتم قوما بورا" (الفتح: ۱۲)

"بلکہ تم نے تو یہ سمجھا کہ رسول اور مومنین اپنے گھر والوں میں کبھی لوٹ کر نہیں آئیں گے اور تمہارے دلوں کو یہ بات بھا گئی اور تم نے برے برے گمان کئے اور تم تو برباد ہونے والے لوگ ہو۔"

اس آیت میں اور اس طرح کی دوسری آیات میں صرف "ظَنَّ السَّوْء" ہی واحد ممکن

قرات نہیں ہے۔ بعض ماہرین کے نزدیک متبادل قرات "ظَنَّ السَّوْء" بھی جائز ہے۔ بعض دوسرے حضرات کی رائے میں اسے "سَوء" یا "سُوء" پڑھنے سے یقینی طور پر معنی بدل جاتے ہیں۔ اول الذکر (سَوء) سے مراد فساد یا تباہی ہے جبکہ موخر الذکر (سُوء) کا مطلب نقصان، شکست یا شر نکلتا ہے۔[1]

ہماری رائے میں ان تمام بیانات کی کوئی اصل نہیں۔ ظن السَوء اور ظن السُوء میں فرق محض نحوی مسئلہ ہے۔

انہی آیات میں "ظن السوء" کے علاوہ سوء کی ایک اور ترکیب "دائرہ السوء" بھی استعمال ہوئی ہے، جس کا مطلب ہے برائی کی باری یا برائی کا چکر، یہاں بھی دو متبادل قراتیں ممکن ہیں۔ سَوٴ اور سُوٴ۔ یہی بات سورہ الفرقان میں بھی کہی جاسکتی ہے جہاں کہا گیا ہے کہ "شہر برائی کی بارش سے تباہ ہو گیا۔" عموماً مفسرین کے نزدیک یہاں شہر سدوم مراد ہے جو روایت کے مطابق پتھروں کے برسنے سے مکمل طور پر تباہ ہو گیا تھا۔ اس مثال میں بھی سوٴ کو دونوں طریقوں سے پڑھا جا سکتا ہے۔ بعض مفسرین نے یہاں بھی دونوں کے درمیان معنوی فرق کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر سُوٴ پڑھا جائے تو نقصان، چوٹ مطلب نکلے گا اور سَوٴ پڑھا جائے تو تباہی مراد ہو گا۔

بہرکیف یہ واضح ہو گیا کہ معنویاتی لحاظ سے سَوٴ ایسی صفت ہے جس کا اطلاق بہت وسیع ہے کیونکہ یہ ہر اس شے کو شامل ہے جسے سیئی (برا) کہا جا سکتا ہے۔ بالکل یہی بات اسم مصدر سُوٴ پر بھی صادق آتی ہے۔

عام مفہوم میں سوٴ سے مراد ہر وہ شے ہے جو ناپسند یا مذموم خیال کی جاتی ہو یا ہر وہ چیز جس سے نفرت اور بیزاری کا ردعمل ابھرے۔

"واذا بشر احدهم بالانثى ظل وجهه مسودا وهوكظيم

(۱) دیکھئے: بطرس البستانی، محیط المحیط، جلد دوم، صفحہ ۱۰۲۔

یتواری من القوم من سوء ما بشر به" (النحل: ۵۸۔۵۹)

"اور جب ان میں سے کسی کو بیٹی کی خبر دی جائے تو اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے اور وہ غصّے سے گھٹتا ہے جس چیز کی اس کو خبر دی گئی ہے۔ اس کی برائی (عار) سے لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے۔"

اس آیات میں زمانہ جاہلیت کے بعض قبائل کے اس مشہور رواج کی طرف اشارہ ہے جو بیٹیوں کو ناپسند کرتے تھے حتیٰ کہ ان کو پیدا ہوتے ہی زندہ دفن کر دیتے تھے۔ یہ آیت برائی سے وابستہ احساس اور واردات کے اندرونی پہلو کو بیان کرتی ہے۔ اس سے یہ بات بھی فطری طور پر سمجھ میں آتی ہے کہ قرآن کریم میں دوزخ کو بار بار برا ٹھکانہ کیوں کہا گیا ہے۔

"والذین ینقضون عهد الله من بعد میثاقه ویقطعون ما امر الله به ان یوصل ویفسدون فی الارض اولئک لهم اللعنه ولهم سوء الدار" (الرعد: ۲۵)

"جو لوگ اللہ تعالیٰ کے معاہدوں کو وعدے کے بعد توڑ دیتے ہیں اور جن رشتوں کو جوڑنے کا حکم دیا گیا ہے، کاٹ ڈالتے ہیں اور زمین پر فساد کرتے ہیں، ان پر لعنت ہے اور ان کے لیے برا گھر ہے۔"

قرآن کریم میں ایسی مثالیں بکثرت موجود ہیں جہاں اس بنیادی مفہوم میں سوٗ سے مراد کسی قسم کا نقصان، چوٹ، مصیبت اور ابتلاٗ لیا جا سکتا ہے۔ یہاں تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ آیئے اب ہم دیکھتے ہیں کہ دینی اخلاقی میدان میں سوٗ کا لفظ کیسے استعمال ہوتا ہے۔ پہلی مثال ہم سورہ یوسف سے لیتے ہیں۔ حضرت یوسف خود اپنے بارے میں فرماتے ہیں۔

"وما ابری نفسی ان النفس لاماره بالسوء الا ما رحم ربی"

(یوسف: ۵۳)

"میں اپنے کو بری نہیں کرتا کیونکہ نفس تو برائی کی طرف لے جاتا ہے' سوائے اس کے کہ میرا رب جس پر رحم کرے۔"

اس آیت میں "برائی" کا مطلب بہت واضح ہے یعنی دنیوی لذات اور نفسانی خواہشات میں بے قابو ہو جانا۔ اگلی آیت سے بھی بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ مذہبی میدان میں سوٴ کا مطلب بعینہ وہی ہے جو اوپر "سیئات" کی بحث میں مذکور ہوا۔

"انما التوبه علی الله للذین یعملون السوء بجهاله ثم یتوبون من قریب فاولئک یتوب الله علیهم وکان الله علیما حکیما۔ ولیست التوبه للذین یعملون السیئت' حتی اذا حضر احدهم الموت قال انی تبت الئن" (النساء : ۱۸،۱۷)

"اللہ کے لیے توبہ قبول کرنا صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو لاعلمی میں برائی کر بیٹھتے ہیں پھر جلد ہی توبہ کر لیتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی طرف اللہ توجہ فرماتا ہے اور اللہ خوب جانتا ہے اور حکیم ہے۔ ایسے لوگوں کی توبہ نہیں جو برائیاں کرتے رہتے ہیں اور جب موت سامنے آکھڑی ہوتی ہے تو کہتے ہیں' میں اب توبہ کرتا ہوں۔"

اگلی آیت میں سوٴ کے اس مفہوم کو (یعنی لاعلمی میں برائی کرنا) "اصلح" کے بالمقابل استعمال کیا گیا ہے۔

"من عمل منکم سوأ بجهاله ثم تاب من بعده واصلح فانه غفور رحیم" (الانعام : ٥٤)

"تم میں سے جو شخص لاعلمی میں برا کام کر بیٹھے پھر وہ اس کے بعد توبہ کر لے اور اصلاح کر لے تو اللہ تعالیٰ بہت مغفرت کرنے والا بڑی رحمت

کرنے والا ہے۔"

سوٗ "ظلم النفس" یعنی اپنی ذات پر ظلم کے مترادف بھی استعمال ہوا ہے۔ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کفر کے بارے میں یہ قرآن کریم کی مخصوص عبارت ہے۔

"الذین تتوفھم الملئکه ظالمی انفسھم فالقوا السلم ماکنا نعمل من سوء بلی ان الله علیم بما کنتم تعملون" (النحل : ۲۸)

"جن کی جان فرشتوں نے قبض کی جب کہ وہ اپنے نفس پر ظلم کرتے تھے (حالت کفر میں تھے) تو وہ صلح کا ڈول ڈالیں گے کہ ہم نے تو کوئی برا کام نہیں کیا' کیوں نہیں! بے شک اللہ کو تمہارے ہر عمل کی خبر ہے۔"

اگلی آیت میں سوٗ کا مطلب بہت واضح الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ یہاں پتہ چلتا ہے کہ قرآن کریم میں کس قسم کے فعل کو "برا کام" کہا گیا ہے۔

"وقال فرعون یھا من ابن لی صرحا لعلی ابلغ الاسباب اسباب السمٰوات فاطلع الی اله موسی وانی لاظنه کاذبا وکذلک زین لفرعون سوء عمله وصدعن السبیل" (المومن : ۳۶۔۳۷)

"اور فرعون نے کہا' اے ہامان! میرے لیے ایک بلند عمارت بناؤ۔ شاید میں آسمان تک جانے کی راہوں تک پہنچ جاؤں' پھر موسیٰ کے خدا کو دیکھوں اور میں تو موسیٰ کو جھوٹا ہی سمجھتا ہوں۔ اور اس طرح فرعون کو اس کے برے عمل بھی اچھے معلوم ہوتے تھے اور وہ سیدھے رستے سے رک گیا تھا۔"

۷۔ فحشاء/فاحشه

فحشاء اور فاحشہ سے مراد مقررہ حدود کی خلاف ورزی' بے حساب غلط اور قابل

مذمت کام ہے۔ قرآن کریم میں یہ لفظ اکثر سوٗ کے ساتھ مرکب استعمال ہوا ہے جس کا ذکر ہو چکا ہے۔

"ولا تتبعو خطوات الشیطن' انه لکم عدو مبین انما یامرکم بالسوء والفحشاء وان تقولوا علی الله مالاتعلمون" (البقرہ: ١٦٩)

"اور تم شیطان کے پیچھے پیچھے مت چلو' وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ وہ تمہیں برائی اور بے حیائی کا حکم دیتا ہے اور یہ کہ تم اللہ کے بارے میں ایسی باتیں کہو جن کا تمہیں علم نہیں۔"

مفسرین نے اس آیت میں سوٗ اور فحشاٗ میں فرق پر بہت بحث کی ہے۔ بہت کچھ لکھا گیا ہے اور مختلف آراٗ بیان کی گئی۔ لیکن ان میں سے ایک بھی مستند نہیں۔ اس ساری بحث سے صرف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ دونوں الفاظ عمومی مفہوم میں مترادف ہیں۔

"ولقد همت به وهم بها لولا ان رآ برهان ربه کذلک لنصرف عنه السوء والفحشاء انه من عبادنا المخلصین" (یوسف: ٢٤)

"وہ عورت (عزیز مصر کی بیوی) ان پر مرمٹی' وہ بھی اس پر مرمٹتے اگر انہوں نے اپنے رب کی دلیل دیکھی نہ ہوتی۔ اس طرح ہم نے انہیں برائی اور بے حیائی سے روک دیا' بے شک وہ ہمارے برگزیدہ بندے تھے۔"

سیاق سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ یہاں سوٗ اور فحشاٗ سے مراد زنا ہے۔ اگلی مثال سے یہ مطلب اور بھی زیادہ واضح ہو جاتا ہے۔

"لاتقربوا الزنی انه کان فاحشه وساء سبیلا" (بنی اسرائیل: ٣٢)

”زنا کے قریب بھی مت جاؤ بلاشبہ یہ بے حیائی ہے اور برا راستہ ہے۔“

لواطت کو بھی اکثر فاحشہ بتایا گیا ہے۔ ہم صرف ایک مثال دیں گے۔

”ولوطا اذ قال لقومه اتاتون الفاحشه ما سبقكم بها من احد من العلمين“ (الاعراف: ۸۰)

”اور لوطؑ جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا، تم یہ بے حیائی کا کام کرتے ہو جو تم سے پہلے دنیا میں کسی نے نہیں کیا۔“

سورۂ ھود میں كانوا يعملون السيئات (وہ برے کام کرتے تھے۔ آیت ۷۸) میں قوم لوطؑ کی اسی عادت کو ”سیئات“ بتایا گیا ہے جو کہ اس بات کا مزید ثبوت ہے کہ ف۔ح۔ش اور س۔و۔ء اس قسم کے معاملات میں تقریباً ہم معنی ہیں۔

ایک اور آیت میں اپنے ہی باپ کی موت یا طلاق کے بعد اس کی بیوی سے شادی کرنے کی جاہلی رسم کی مذمت کے لیے لفظ مقت استعمال ہوا ہے جس کا مطلب ہے۔ انتہائی قابل نفرت عمل۔ اس آیت میں یہ لفظ اور ”فاحشہ“ ساتھ ساتھ آئے ہیں۔

”ولاتنكحوا ما نكح آباوكم من النساء الا ما قد سلف، انه كان فاحشه ومقتا وساء سبيلا“ (النساء: ۲۲)

”تم ان عورتوں سے نکاح نہ کرو جن سے تمہارے باپ نے نکاح کیا ہو، مگر جو بات پہلے ہو چکی وہ الگ ہے، بے شک یہ بہت بے حیائی، بے حد قابل نفرت اور برا طریقہ ہے۔“

ایک اور آیت میں فاحشہ کے ساتھ لفظ منکر بھی استعمال ہوا ہے۔ جس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں۔

”يا ايها الذين آمنو لاتتبعوا خطوات الشيطن ومن يتبع خطوات الشيطن فانه يامر بالفحشاء والمنكر“ (النور: ۲۱)

''اے ایمان والو! تم شیطان کے قدم بہ قدم مت چلو جو شیطان کے پیچھے پیچھے چلتا ہے تو وہ تو بے حیائی اور قابل مذمت کاموں کا حکم دیتا ہے۔''

اس آیت میں فحشاء کو واضح طور پر شیطان کی انگیخت بتایا گیا ہے۔ شروع میں سورہ بقرہ کی آیت ۱۶۴ کا ذکر ہوا' وہ بھی اسی نکتے کی تائید کرتی ہے۔ درحقیقت فاحشہ اور فحشاء کی خصوصیت ہے کہ قرآن کریم میں یہ الفاظ اکثر شیطان کے نام کے ساتھ آتے ہیں۔

"الشیطن یعدکم الفقر ویامرکم بالفحشاء واللہ یعدکم مغفرہ منہ وفضلا" (البقرہ: ۲٦۸)

''شیطان تم سے غریبی کا وعدہ کرتا ہے اور بے حیائی کے کام کا حکم دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تم سے اپنی مغفرت کا وعدہ کرتا ہے اور خوشحالی کا وعدہ کرتا ہے۔''

"انا جعلنا الشیطن اولیاء للذین لایومنون واذا فعلوا فاحشہ قالوا وجدنا علیھا آباء نا واللہ امرنا بھا قل ان اللہ لا یامر بالفحشاء اتقولون علی اللہ ما لاتعلمون" (الاعراف: ۲۷۔۲۸)

''ہم نے شیاطین کو ان لوگوں کا ساتھی بنایا جو ایمان نہیں رکھتے۔ جب وہ کوئی بے حیائی کا کام کرتے ہیں تو کہتے ہیں ہم نے اپنے باپ دادا کو اسی راستے پر پایا اور اللہ نے ہم کو یہی حکم دیا ہے۔ ان سے کہہ دیجئے کہ اللہ بے حیائی کا حکم نہیں دیتا۔ کیا تم خدا کے بارے میں ایسی بات کہہ رہے ہو جس کا تمہیں علم نہیں۔''

اس کے برعکس اللہ تعالیٰ نے تمام فحشاء کی سختی سے ممانعت کی ہے اور انصاف اور مہربانی کا حکم دیا ہے۔

"ان الله یامر بالعدل والاحسان وایتآیئ ذی القربی وینهی عن الفحشاء والمنکر والبغی" (النحل: ۹۰)

"بے شک اللہ تعالیٰ انصاف' نیکی اور رشتے داروں کے حقوق ادا کرنے کا حکم دیتا ہے اور بے حیائی اور قابل مذمت کاموں اور ظلم کرنے سے منع کرتا ہے۔"

طیب اور خبیث

طیب اسم صفت ہے جس کا سب سے بنیادی معنوی عمل یہ ہے کہ وہ کسی چیز کی ان صفات کی نشاندہی کرتا ہے۔ جن کا احساس سونگھنے اور چکھنے کے حواس سے ہوتا ہے۔ خصوصاً ایسی صفات جو مزیدار' خوش کن اور شیریں ہوں۔ چنانچہ حسب توقع یہ لفظ اکثر خوراک' پانی' خوشبو اور اسی قسم کی چیزوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ یہ اس کا خصوصی معنویاتی دائرہ ہے۔ تاہم اسے اس کے باہر بہت سی اور چیزوں کے لیے بولا جا سکتا ہے۔ مثلاً قرآن کریم میں ہمیں اس طرح کی عبادات بھی ملتی ہیں جیسے ریح طیبہ (سازگار ہوا) جو جہاز کو سمندر پر ہموار لے جاتی ہے۔ (یونس: ۲۲) بلد طیبہ (اچھی زرخیز زمین) (الاعراف: ۵۸) مساکن طیبہ (خوشگوار مکانات) یعنی جنت کے باغوں میں مومن مردوں اور عورتوں کے آخری ٹھکانے۔ (التوبہ: ۷۲)

جیسا کہ ہر شخص جانتا ہے کہ جو چیزیں مختلف قسم کی ممانعت اور حرمت کا ہدف بنتی ہیں' ان میں اشیائے خوراک سرفہرست ہیں۔ اس ضمن میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ قرآن کریم نے اس کے بارے میں "حلت" کا ایک خصوصی تصور دیا جس کی رو سے طیب کو حلال (جائز) سے وابستہ کر کے "اسے ہر قسم کی حرمت سے بری" قرار دیا۔ چنانچہ اس مخصوص حوالے سے طیب اور حلال تقریباً ہم معنی بن جاتے ہیں۔ حلال پر بحث اگلی فصل میں ہوگی۔

"یسئلونک ماذا احل لهم قل احل لکم الطیبٰت" (المائده: ٤)

''تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ان کے لیے کیا چیز حلال ہے؟ کہہ دے کہ تم کو ستھری چیزیں حلال ہیں۔''

"وكلوا مما رزقكم الله حلالاً طيباً" (المائده: ۸۸)

''اور اللہ کے دیئے ہوئے میں سے جو چیز حلال پاکیزہ ہو' کھاؤ۔''

لفظ طیب' اگرچہ اتنی کثرت سے نہیں' خاص مذہبی اخلاقی مفہوم میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس کی ایک عمدہ مثال مندرجہ ذیل ہے:

"جنت عدن يدخلونها من تحتها الانهر لهم فيها مايشاون كذلک يجزی الله المتقين الذين تتوفهم الملئكه طيبين' يقولون سلام عليكم ادخلو الجنه بما كنتم تعملون" (النحل: ۳۱.۳۲)

''وہ ہمیشہ رہنے والے باغوں میں جائیں گے' جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں' وہاں ان کے واسطے جو چاہیں موجود ہے۔ تم پر سلامتی ہو۔ بہشت میں جاؤ۔ جو تم کرتے تھے' یہ اس کا بدلہ ہے۔''

اس سیاق سے بہت اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ یہاں ''طیب'' ''متقی'' کا متبادل ہے۔ علاوہ ازیں اسی صورت کی آیت ۲۸ (الذين تتوفهم ظالمی انفسهم) ''فرشتے جن کی جان قبض کرتے ہیں تو انہوں نے اپنی جان پر ظلم کئے ہوتے ہیں) میں طیبین (ستھرے) کے متوازی اور متضاد ''جنہوں نے اپنی جان پر ظلم کیا'' آیا۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں اس عبارت سے مراد کفار ہیں۔

الکلم الطیب (اچھی گفتگو) کی ترکیب میں جو سورہ فاطر کی آیت ۱۱ میں آئی ہے' طیب کا یہی مفہوم ہے۔ عام طور پر اس سے مراد کلمہ توحید ہے یعنی ''اللہ کے سوا کوئی خدا نہیں''۔ بہرکیف یہ بات طے ہے کہ اس عبارت میں طیب سے مراد ''مذہبی طور پر اچھا'' یا

نیک ہے کیونکہ یہ عبارت اس آیت میں العمل الصالح یعنی نیک عمل کے ساتھ استعمال ہوئی ہے۔

"الیه یصعد الکلم الطیب والعمل الصالح یرفعه" (فاطر : ۱۱)

"ستھری بات اور نیک عمل اس کی طرف چڑھتے ہیں' وہ ان کو اٹھا لیتا ہے۔"

طیب کے عین متضاد "خبیث" ہے۔ یہاں اب ان مثالوں کے جائزے کی ضرورت نہیں جن میں یہ لفظ عام واقعات اور اشیاءُ کے لیے استعمال ہوا۔ اب ہمیں صرف ان چند مخصوص مثالوں پر مختصر بحث کرنا ہے جہاں یہ لفظ مذہبی اخلاقی مفہوم میں آیا ہے۔ آیئے پہلی مثال سے شروع کرتے ہیں جس کا تعلق اشیائے خوراک کی حلت و حرمت کے مسئلے سے ہے۔

"ویحل لهم الطیبت ویحرم علیهم الخبئث" (الاعراف : ۱۵۷)

"وہ ان کے لیے پاک چیزیں حلال کرتا ہے اور ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے۔"

اس آیت میں بہت واضح طور پر طیب اور خبیث کے جوڑے کو بہت اہم انداز میں حلال اور حرام کے جوڑے کے متوازی بیان کیا گیا ہے۔ ہم ابھی دیکھیں گے کہ ان میں دوسرے جوڑے کے مفہوم کا تعلق عبادتی پاکیزگی سے ہے جو نظریہ حرمت کے دائرہ کار میں آتا ہے۔

اگلی آیت میں طیب اور خبیث' مومن اور کافر کے متضاد استعمال ہوئے ہیں۔

"والذین کفروا الی جهنم یحشرون یمیز الله الخبیث من الطیب ویجعل الخبیث بعضه علی بعض فیرکمه جمیعا فیجعله فی جهنم" (الانفال : ۳۶۔۳۷)

"اور جو کافر ہیں وہ دوزخ کی طرف ہانکے جائیں گے تا کہ اللہ ناپاک کو پاک

سے جدا کر دے اور ناپاک کو ایک دوسرے پر رکھے اور پھر سب کو ڈھیر کر دے اور پھر جہنم میں ڈال دے۔"

"الخبيثت للخبيثين والخبيثون للخبيثت والطيبت للطيبين والطيبون للطيبات" (النور: ٢٦)

"گندی عورتیں گندے مردوں کے لیے ہیں اور گندے مرد گندی عورتوں کے لیے' ستھری عورتیں ستھرے مردوں کے لیے اور ستھرے مرد ستھری عورتوں کے لیے۔"

اگلی مثال میں خبیث کا لفظ اہل سدوم کی قابل مذمت عادت کے بارے میں ہے' جنہیں سوٴ اور فاسق لوگ کہا گیا ہے۔ یہ تمام عناصر مجموعی طور پر بہت ہی صراحت سے خبیث کے لفظ کے معنوی مشتملات کو واضح کرتے ہیں۔[(۲)]

"ولوطا آتينه حكما وعلما ونجينه من القريه التى كانت تعمل الخبئث انهم كانوا قوم سوء فسقين" (الانبياء: ٧٤)

"اور ہم نے لوط ؑ کو حکم اور علم دیا اور اسے اس بستی سے بچا کر نکال لیا جو گندے کام کرتی تھی۔ بے شک وہ لوگ برے نافرمان تھے۔"

۹۔ حرام اور حلال

الفاظ کا یہ جوڑا ہمیں نظریہ حرمت کی کائنات میں لے جاتا ہے۔ حرام اور حلال زبان کی ایک بہت ہی قدیم پرت سے تعلق رکھتے ہیں۔ درحقیقت اس کے ڈانڈے عبادتی پاکیزگی کے قدیم سامی تصور سے جا ملتے ہیں۔ زیادہ واضح الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ حرام

(۲) زمانہ جاہلیت میں یہ لفظ ایک اخلاقی قدر کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اس کی مثال عنترہ کا مندرجہ ذیل شعر ہے:

يعيبون لونى بالسواد وانما فعالهم بالخبث اسود من جلدى (دیوان عنترہ' ص ۶۲)

یعنی یہ لوگ میرے کالے رنگ کو عیب شمار کرتے ہیں' سچ یہ ہے کہ ان کے اپنے کرتوت اتنے گندے ہیں کہ میرے رنگ سے کہیں سیاہ۔

سے مراد مذہبی ممانعت لاگو تھی' اب اس ممانعت سے آزاد ہے۔ حرام کا اطلاق اشیا' مقامات اشخاص اور افعال سب پر ہوتا ہے اور جس چیز کو حرام کہا جائے وہ عام غیر مقدس اشیا کی دنیا سے الگ ہو جاتی ہے۔ اس کا درجہ بلند ہو کر موجودات کی اس خصوصی سطح پر پہنچ جاتا ہے کہ وہ تقدس اور ناپاکی کے ذو معنی مفہوم میں ''حرام'' ہو جاتی ہے۔ بہرکیف یہ وہ چیز ہے جسے نہ حاصل کیا جا سکتا ہے نہ چھوا جا سکتا ہے۔

اس کی ایک صریح مثال یہ ہے کہ اسلام سے پہلے عرب میں اگر کوئی شخص قسم اٹھاتا کہ وہ اپنے قریبی رشتہ دار کے قتل کا انتقام لے گا تو اس کے لیے شراب نوشی اور سر دھونا حرام ہو جاتے تھے اور جب تک اس کی قسم پوری نہ ہوتی' یہ ''حرمت'' جاری رہتی۔ یہ بات تابط شرا کے مندرجہ ذیل شعر سے بہت کھل کر سامنے آتی ہے۔ تابط شرا نے یہ شعر اپنے ماموں کے قاتل سے بدلہ لینے پر کہے:

حلت الخمر وکانت حراما

وبالذی ما المت تحل(۳)

(ترجمہ): اب شراب میرے لیے حلال ہو گئی ہے جو بہت مدت سے حرام رہی۔ یہ کام بہت کٹھن تھا جس نے آخر کار اسے حلال کر دیا۔

یہ نہایت اہم ہے کہ متاخرین فقہا کی کتب میں ''حرام'' کی تعریف رسمی طریقے سے ان لفظوں میں کی گئی ہے کہ ''ایسا فعل جو قانون کے نزدیک سزا کے قابل ہو'' جس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ ''ہر وہ چیز جو مطلقاً منع ہے۔ یہ بات بے حد اہم ہے۔ اس لفظ کا قرآنی استعمال معنوی ارتقا کے اس درمیانی مرحلے کو ظاہر کرتا ہے جہاں یہ لفظ حرمت کے ابتدائی تصور سے گزر کر قانونی تصور میں داخل ہوتا ہے۔ اس جاہلی تصور کی اسلامی تصورات میں

(۳) ابو تمام: دیوان الحماسۃ: شرح الخطیب التبریزی' قاہرہ (۱۹۵۵ء) ج ۱/۲۱ (تحقیق محمد علی عزام)

شمولیت اس لئے ممکن ہوئی کہ اسلام کی رو سے اللہ تعالیٰ اپنے حکم میں مطلقاً خود مختار ہے۔ اللہ تعالیٰ کو مطلق اختیار ہے کہ وہ کسی بھی شے پر پابندی اٹھا لے چنانچہ جس چیز سے خدا منع کر دے وہ حرام ہے اور اس کے برعکس حلال۔ اس طرح حلال اور حرام کے قدیم تصور کا تعلق مشیت الٰہی کے اظہار کی صورت میں اللہ تعالیٰ سے گہرا ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ کا کسی چیز کو منع کرنے اور اس چیز کا حرام ہونے میں تسبب کا جو براہ راست تعلق ہے وہ مندرجہ ذیل آیت سے بہت اچھی طرح واضح ہوتا ہے۔

"واذ اخذنا میثاقکم لاتسفکون دماء کم ولاتخرجون انفسکم من دیارکم ثم اقررتم وانتم تشھدون' ثم انتم ھولاء تقتلون انفسکم وتخرجون فریقا منکم من دیارھم' تظھرون علیھم بالاثم والعدوان وان یاتوکم اساری تفدوھم وھو محرم علیکم اخراجھم" (البقرہ : ۸۴۔۸۵)

"جب ہم نے تم سے وعدہ لیا کہ تم آپس میں خون نہیں بہاؤ گے اور اپنے لوگوں کو وطن سے نہ نکالو گے۔ تم اقرار کرتے ہو اور تم اس پر گواہ ہو' پھر اب تمہی لوگ آپس میں قتل کرتے ہو' ایک فریق کو اپنے وطن سے نکالتے ہو' ان پر ظلم سے چڑھائی کرتے ہو اور اگر وہ تمہارے پاس قیدی ہو کر آئیں تو ان کا بدلہ دے کر چھڑاتے ہو' حالانکہ تم پر ان کو نکال دینا حرام کر دیا گیا تھا۔"

فطری طور پر نئے پیغمبر کی آمد سے جو مشیت الٰہی کا نیا ترجمان ہوتا تھا' حرام اور حلال کے موجودہ نظام میں بہت سی تبدیلیاں لازمی تھیں۔ قرآن کریم میں حضرت عیسیٰ ؑ کی زبان سے اعلان ہوا۔

"ومصدقا لما بین من التورته ولاحل لکم بعض الذی حرم

علیکم" (آل عمران : ۵۰)

"اور اپنے سے پہلی کتاب توریت کی تصدیق کرتا ہوں اور اس لئے کہ تم کو بعض وہ چیزیں حلال کر دوں جو تم پر حرام نہیں۔"

اسی طرح اب جب اسلام کا ظہور ہو چکا' قرآن کریم میں اعلان ہوتا ہے کہ حرمت کے تمام اسرائیلی احکام مکمل طور پر منسوخ ہو گئے اور ان کی جگہ اب نئے اور یقیناً بہتر احکام آ گئے ہیں۔ چنانچہ بدیہی مثال کو لیجئے' قرآن کریم کے مطابق اشیائے خوراک کے بارے میں یہودی محرمات دراصل یہود کی سرکشی کی سزا کے طور پر نافذ کئے گئے تھے۔ (الانعام:۱۴۶)

جہاں تک زمانہ جاہلیت کے بہت سے عرب محرمات کا تعلق ہے ان کی حیثیت اللہ تعالیٰ پر محض افتراءٗ (جعل سازی) کی ہے۔ (الانعام:۱۴۴) لیکن ان محرمات کو یکسر منسوخ کرنے کی بجائے قرآن کریم ان محرمات کی ایک ترمیم شدہ فہرست جاری کرتا ہے جن کا اللہ کے نام سے اعلان ہوتا ہے۔

"انما حرم علیکم المیته والدم ولحم الخنزیر وما اهل به لغیر الله" (البقره : ۱۷۳)

"اس نے تم پر صرف یہ چیزیں حرام کی ہیں: مردار' لہو' سور کا گوشت اور جس جانور پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام پکارا جائے۔"

"احل لکم صید البحر وطعامه متاعا لکم وللسیاره وحرم علیکم صید البحر ما دمتم حرما" (المائده : ۹۶)

"تمہارے لئے دریا کا شکار اور کھانا حلال کر دیا گیا' تمہارے اور سب مسافروں کر فائدے کے لئے۔ تم پر خشکی کا شکار حرام کر دیا گیا' جب تم احرام کی حالت میں ہو۔"(۴)

(۴) سورہ المائدہ کی آیت نمبر تین میں زیادہ مکمل فہرست ہے۔ (مترجم)

یاد رہے جو لوگ حج کا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں وہ اپنے عام زندگی کے لباس اتار کر جب مخصوص مقدس لباس (احرام) پہن لیتے ہیں تو وہ خود حالت احرام میں آ جاتے ہیں۔ اب انہیں بال کاٹنے' ناخن اتارنے اور جنسی مباشرت کی سختی سے ممانعت ہے۔

یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ حرمت کے لیے یہ الفاظ بعض اوقات اس عام درجے سے کہیں اعلیٰ مفہوم میں استعمال ہوتے ہیں۔ خصوصاً ایسے معاملات میں جن کا تعلق براہ راست اسلام کے بنیادی عقائد سے ہے۔ اس طرح گویا حرمت کا ایک نیا اخلاقی اور روحانی تصور ظاہر ہوتا ہے جو کفر کے بہت سے مظاہر کو حرام قرار دے کر زمانہ جاہلیت کے حرمت کے تصور میں اخلاقی عناصر کو شامل کر لیتا ہے۔

"قل انما حرم ربی الفواحش ماظهر منها وما بطن والاثم والبغی بغیر الحق وان تشرکوا بالله مالم ینزل به سلطنا وان تقولوا علی الله ما لا تعلمون" (الاعراف :۳۳)

"کہہ دیجئے' میرے رب نے صرف بے حیائی کی باتوں کو حرام کر دیا ہے جو ان میں کھلی ہوئی ہیں اور چھپی ہوئی ہیں۔ اور گناہ' ناحق زیادتی اور اس بات کو (حرام کر دیا ہے) کہ تم اللہ کے ساتھ ایسی چیز کو شریک ٹھہراؤ جس کے لیے اس نے سند نہیں اتاری اور یہ کہ تم اللہ کے ذمے ایسی باتیں لگاؤ جن کا تمہیں علم نہیں۔"

عربی زبان میں "حرام" کے لیے ایک اور لفظ بھی ہے جس کی قرآن کریم میں بھی چند مثالیں موجود ہیں۔ یہ لفظ سحت یا سُحُت ہے۔ یہودیوں کے بارے میں جو کہتے تو تھے کہ "ہم ایمان لے آئے" لیکن درحقیقت وہ کفر پر ہی قائم تھے۔ اللہ تعالیٰ حضرت محمدؐ کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں:

"وتری کثیرا منهم یسارعون فی الاثم والعدوان واکلهم

السحت‘لبئس ما کانوا یعملون“ (المائدہ: ٦٢)

”اور آپ دیکھیں گے کہ ان میں سے اکثر دوڑ کر گناہ کی طرف جاتے ہیں۔ ظلم اور حرام کھانے پر لپکتے ہیں‘ وہ جو کام کر رہے ہیں وہ بہت برے ہیں۔“

اسی سورت میں ۴۲ ویں آیت میں انہی یہودیوں کو اکالون للسحت یعنی حرام چیزوں کو ہڑپ کرنے الے کہا گیا ہے۔ یہاں حرام کا صحیح معنی کیا ہے۔ یہ بات یقین سے تو نہیں کہی جاسکتی۔ اگرچہ عین ممکن ہے کہ اس کا اشارہ سود کی طرف ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ سود پر قرض دینے کی ممانعت شروع میں یہودیوں کے حوالے سے ہی نازل ہوئی تھی۔[۵]

قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیت اس موقف کی تائید کرتی ہے:

”فبظلم من الذین ھادوا حرمنا علیھم طیبت احلت لھم وبصدھم عن سبیل اللہ کثیرا واخذھم الربوا وقد نھوا عنہ واکلھم اموال الناس بالباطل“ (النساء: ١٦٠۔١٦١)

”چنانچہ یہود کے ظلم کی وجہ سے ہم نے ستھری چیزیں جو ان کے لیے حلال تھیں‘ حرام کر دیں۔ اس وجہ سے کہ وہ اللہ کی راہ سے بہت روکتے تھے اور اس وجہ سے کہ وہ سود لیتے تھے جبکہ ان کو اس سے منع کیا گیا تھا اور اس وجہ سے کہ وہ لوگوں کا مال ناحق کھاتے تھے۔“

جہاں تک حلال کا تعلق ہے معنویاتی طور پر اس کے بارے میں کچھ زیادہ کہنے کی گنجائش نہیں ہے۔ کوئی بھی چیز جو حرام نہیں ہے‘ وہ حلال ہے۔ یا یوں کہا جا سکتا ہے کہ جس چیز پر سے بھی ممانعت کا حکم اٹھا لیا جائے وہ حلال ہے۔ اس کی چند مثالیں کافی ہوں گی۔

”یا ایھا الناس کلوا مما فی الارض حللا طیبا ولاتتبعوا خطوات الشیطن“ (البقرہ: ١٦٨)

(۵) دیکھیے: منٹگمری واٹ: ”محمد ایٹ مدینہ“ (آکسفورڈ ۱۹۹۶ء) ص ۲۹۶-۲۹۷

"اے لوگو! زمین کی چیزوں میں سے جو حلال اور پاکیزہ ہیں' وہ کھاؤ اور شیطان کی پیروی نہ کرو۔"

اس کے بعد کی اگلی چند آیات میں اسی بات کو مختلف طریقے سے بیان کیا گیا ہے۔ اس مرتبہ "حلال۔ طیب" کے مرکب کی جگہ صرف طیبات استعمال ہوا ہے:

"یا ایها الذین آمنوا کلوا من طیبٰت ما رزقنکم واشکروا الله ان کنتم ایاه تعبدون" (البقرہ: ۱۷۲)

"اے ایمان والو! ہم نے جو رزق دیا ہے' اس میں سے پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور اگر تم صرف اسی کی عبادت کرتے ہو تو اس کا شکر کرو۔"

"کل الطعام کان حلا لبنی اسرائیل الا ما حرّم علی نفسه من قبل ان تنزل التوره" (آل عمران: ۹۳)

"بنی اسرائیل کو کھانے کی سب چیزیں حلال نہیں سوائے جن کو اسرائیل نے تورات نازل ہونے سے پہلے خود اپنے پر حرام کر لیا تھا۔"

اگلی آیت کا تعلق خاوند اور اس کی مطلقہ بیوی کے رشتہ سے ہے۔ سیاق و سباق سے پتہ چلتا ہے کہ حرمت کی خلاف ورزی گناہ ہے جس کے لیے لفظ جناح استعمال ہوا ہے۔ اس لفظ کے بارے میں ہم آگے چل کر بھی بحث کریں گے۔

"فان طلقها فلا تحل له من بعد حتی تنکح زوجا غیره' فان طلقها فلا جناح علیهما ان یتراجعا ان ظنا ان یقیما حدود الله" (البقرہ: ۲۳۸)

"پھر اگر اس نے اس عورت کو طلاق دے دی تو اب وہ اس کے لیے حلال نہیں' جب تک وہ عورت اس کے علاوہ کسی خاوند سے نکاح کرے اور پھر وہ اس کو طلاق دے دے تو دونوں کے لئے کوئی گناہ نہیں کہ وہ پھر باہم مل

جائیں اگر وہ خیال کریں کہ وہ اللہ کی حدود کو قائم رکھیں گے۔"

جیسا کہ ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں کہ جب کسی چیز پر حرمت کا اطلاق ہوتا ہے تو وہ چیز اپنے عام وجود سے اوپر کا درجہ اختیار کر لیتی ہے۔ اب یہ چیز پاکی اور ناپاکی کے اصلی دوہرے معنی میں حرام ہو جاتی ہے۔ یہ اب اچھوت یا ناقابل لمس ہو جاتی ہے۔ قرآن کریم میں حرمت کے اس دوسرے پہلو کو رجس (گندگی) کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے۔ یہ لفظ ناپاکی یا گندگی کے بنیادی معنوں کو بہت ہی شدت سے ظاہر کرتا ہے۔ اس میں طبعی گھن کا شدید احساس بھی پایا جاتا ہے۔ رجس ایسی چیز ہے جس کو انسان طبعی طور پر اس کی بدبو اور گندگی کی وجہ سے شدید نفرت کرتا ہے۔

"حرام" اور "رجس" کے درمیان معنویاتی تعلق کو مندرجہ ذیل آیت سے بہتر طریقے سے سمجھا جا سکتا ہے۔ اس میں ایسی اشیأ کا ذکر ہے جن کا کھانا مسلمانوں پر حرام ہے۔ یہاں بہت صراحت کے ساتھ سور کے گوشت کی ممانعت کی وجہ اس کی ناپاکی بیان کی گئی ہے۔

"قل لا اجد فی ما اوحی الی محرما علی طاعم یطعمه الا ان یکون میته اودما مسفوحا او لحم خنزیر فانه رجس اوفسقا اهل لغیرالله" (الانعام: ۱۴۵)

"کہہ دیجئے کہ اس وحی میں جو مجھ کو پہنچتی ہے' کھانے والے پر کسی چیز کو وہ کھاتا ہے' حرام نہیں پاتا' سوائے مردار' بہتے ہوئے خون اور سور کے گوشت کے کہ وہ ناپاک ہے یا ناجائز ذبیحہ جس پر اللہ کے سوا کسی دوسرے کا نام لیا گیا ہو۔"

ایک اور آیت میں شراب' جوا' بت اور قسمت کا حال معلوم کرنے والے تیروں کی ممانعت کی وجہ ان کی ناپاکی بیان کی گئی ہے۔

"یا ایها الذین آمنوا انما الخمر والمیسر والانصاب

والازلام رجس من عمل الشیطٰن فاجتنبوہ لعلکم
تفلحون" (المائدہ: ۹۰)

"اے ایمان والو! شراب' جوا' بت اور پانسے سب شیطان کے ناپاک کام
ہیں۔ ان سے بچتے رہو تاکہ تم نجات پاؤ۔"

ہمیں اس آیت کا سورہ البقرہ کی آیت نمبر ۲۱۶ سے بھی موازنہ کرنا چاہیے جہاں شراب اور جوے کا بہت بڑا گناہ (اثم) بیان کرکے ان کی مذمت کی گئی ہے۔

"یسئلونک عن الخمر والمیسر قل فیھا اثم کبیر ومنافع
للناس واثمھما اکبر من نفعھما" (البقرہ: ۲۱۹)

"آپ سے پوچھتے ہیں' شراب اور جوے کے بارے میں۔ کہہ دیجئے ان دونوں
میں بہت بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لیے فائدے بھی ہیں۔ ان کا گناہ ان
کے فائدے سے بڑا ہے۔"

ایک اور آیت میں بتوں کو "رجس" کہا گیا ہے۔

"فاجتنبوا الرجس من الاوثان" (الحج: ۳۰)

"سو بتوں کی گندگی سے بچتے رہو۔"

اسی مفہوم کو ایک بیماری بھی کہا گیا ہے جو کافروں کے دلوں کو لگ جاتی ہے۔

"واما الذین فی قلوبھم مرض فزادتھم رجسا الی رجسھم
وماتوا وھم کفرون" (التوبہ: ۱۲۵)

"اور جن کے دل میں بیماری ہے سو ان کی گندگی بڑھا دی گئی' وہ مرنے تک
کافر رہے۔"

اور آخر کار کافروں کو خود رجس بیان کیا گیا ہے۔

"فاعرضوا عنھم انھم رجس ومأوئھم جھنم" (التوبہ: ۹۵)

"سو تم ان کو درگذر کرو' وہ ناپاک ہیں اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے۔"

ہم اس فصل کو ختم کرتے ہوئے ایک اور لفظ نجس کا ذکر کریں گے جو کہ رجس کا ہم معنی ہے۔ چند عرب ماہرین لغت کے نزدیک ان دونوں میں یہ فرق ہے کہ رجس زیادہ تر ان چیزوں کے لیے بولا جاتا ہے جو اپنے مزاج میں پلید ہیں۔ جبکہ نجس ایسی چیزیں جنہیں عقل یا قانون ناپاک قرار دے۔ (۶)

قرآن کریم میں یہ لفظ مشرکین کے حوالے سے بیان ہوا ہے جن کو مسجد حرام کے قریب آنے سے منع کیا گیا ہے کیونکہ وہ ناپاک ہیں۔

"یا ایها الذین آمنوا انما المشرکون نجس فلا یقربوا المسجد الحرام بعدعامهم هذا" (التوبه :۲۸)

"اے ایمان والو! مشرک نجس ہیں' اس برس کے بعد انہیں مسجد حرام کے قریب مت آنے دو۔"

روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے جو بعد میں دوسرے خلیفہ ہوئے' ان اوراق کو ہاتھ لگانا چاہا جن پر قرآن کریم کی ایک سورہ لکھی ہوئی تھی تو ان کی بہن حضرت فاطمہؓ نے جو اپنے خاوند کے ساتھ پڑھ رہی تھیں' انہیں ہاتھ لگانے سے روک دیا۔ یہ واقعہ حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کے وقت کا ہے۔ حضرت فاطمہؓ اس وقت بہت پر عزم مومنہ بن چکی تھیں۔ انہوں نے اپنے بھائی سے فرمایا میرے بھائی! تم نجس ہو کیونکہ تم مشرک ہو۔ ان اوراق کو صرف طاہر یعنی پاک لوگ ہی ہاتھ لگا سکتے ہیں۔ روایت کے مطابق حضرت عمر اٹھے انہوں نے غسل کیا اور اب ان کی بہن نے وہ اوراق پڑھنے کی اجازت دی۔ (۷)

اس واقعہ سے بہت اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ حرمت کا تصور کیا تھا اور پاکی

(۶) البستانی، محیط المحیط' ج ا' ص ۵۵' بحوالہ کلیات

(۷) ابن اسحاق، سیرۃ النبی' ج ا' ص ۲۲۶

اور ناپاکی کے تصورات کس طرح اس سے تعلق رکھتے ہیں۔

گناہ

آخر میں ہم ان کلیدی الفاظ سے بحث کریں گے جو زبانی ابلاغ کے ثانوی درجے سے تعلق رکھتی ہیں جن کے ذریعے مذہبی لحاظ سے برے کاموں کی درجہ بندی ہے، جن کے بارے میں ہم بیان کر چکے کہ جو اخلاقی اور شرعی احکام کی خلاف ورزی پر مشتمل ہیں اور جن کے لیے اس دنیا میں اور اگلی دنیا میں بھاری سزا بیان کی گئی ہے۔

۱۔ ذنب: قرآن کریم میں یہ لفظ بکثرت ایسے قبیح گناہوں کے بارے میں آیا ہے جو اللہ تعالیٰ کے خلاف سرزد ہوتے ہیں۔ مثالوں سے اس نکتے کی وضاحت ہو جاتی ہے۔

تکذیب ذنب ہے:

"واولئک هم وقود النار کدأب آل فرعون والذین من قبلهم کذبوا بآیتنا فاخذهم الله بذنوبهم" (آل عمران: ۱۱)

"اور وہی ہیں دوزخ کا ایندھن جیسے آل فرعون کا دستور تھا اور ان سے پہلوں کا بھی کہ وہ ہماری آیات کو جھٹلاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے پھر ان کے گناہوں پر ان کی پکڑ کی۔"

جیسا کہ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ تکذیب یعنی اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کو جھٹلانا کفر کا ایک مخصوص اظہار ہے۔ درحقیقت یہ لفظ سورہ انفال کی آیت نمبر ۵۴ میں کفر کے متبادل کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ جب کہ باقی الفاظ بعینہ اسی طرح ہیں:

"کدأب آل فرعون والذین من قبلهم کفروا بآیات فاخذهم الله بذنوبهم" (الانفال: ۵۲)

"جیسے آل فرعون کا دستور تھا اور ان سے پہلوں کا بھی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی آیات کا انکار کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے پھر ان کے گناہوں پر ان کی پکڑ کی۔"

''کفر'' ''ذنب'' ہے:

"فاخذهم الله بذنوبهم وما كان لهم من الله بذنوبهم وما كان لهم من الله من واق ذلك بانهم كانت تاتيهم رسلهم بالبينٰت فكفروا فاخذهم الله" (المومن : ۲۱۔۲۲)

''پھر اللہ نے ان کے گناہوں پر انہیں پکڑا اور ان کو اللہ سے بچانے والا کوئی نہیں تھا۔ یہ اس لیے کہ ان کے پاس ان کے رسول کھلی نشانیاں لے کر آتے تھے، پھر وہ انکار کرتے تھے۔ پھر اللہ نے ان کی پکڑ کی۔''

"وقالوا لوكنا نسمع او نعقل ما كنا فى اصحب السعير فاعترفوا بذنوبهم" (الملک : ۱۰۔۱۱)

''وہ کہیں گے اگر ہم سنتے اور سمجھتے تو دوزخ میں نہ ہوتے سو انہوں نے اپنے گناہوں کا اعتراف کر لیا۔''

اس آیت میں لفظ کفر استعمال نہیں ہوا، لیکن یہ بات واضح ہے کہ حوالہ اسی کی طرف ہے۔ ذیل کی آیت میں لفظ استکبار (غرور کی وجہ سے اپنے کو بڑا سمجھنا) کفر کے بجائے استعمال ہوا ہے اور اسے ذنب قرار دیا گیا ہے۔

"وقارون وفرعون وهامٰن ولقد جاء هم موسٰى بالبينٰت فاستكبروا فى الارض وما كانوا سبقين فكلا اخذنا بذنبه" (العنکبوت : ۳۹۔۴۰)

''اور قارون اور فرعون اور ہامان، موسیٰ ان کے پاس کھلی نشانیاں لے کر آئے۔ وہ زمین پر بڑائی دکھانے لگے اور جیت نہیں سکتے تھے پھر ہم نے ہر ایک کو اس کے گناہ پر پکڑ لیا۔''

کفر اور ذنب کے درمیان جو قریبی رابطہ ہے وہ اس طرح بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ

ذنب پر جہنم کی آگ کی سزا لازم ٹھہرائی گئی ہے۔

"والله بصير بالعباد الذين يقولون ربنا اتنا آمنا فاغفرلنا ذنوبنا وقنا عذاب النار" (آل عمران : ۱۵۔۱٦)

"اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو دیکھتا ہے جو کہتے ہیں' اے ہمارے رب! ہم ایمان لائے سو ہمارے گناہوں کو معاف کر دے اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا۔"

ذنب فاحشہ اور ظلم کا مجموعہ ہے:

"والله يحب المحسنين والذين اذا فعلوا فاحشه اوظلموا انفسهم ذكروا الله فاستغفروا لذنوبهم ومن يغفر الذنوب الا الله ولم يصروا على ما فعلوا وهم يعلمون" (آل عمران : ۱۳٤۔۱۳۵)

"اللہ تعالیٰ نیکی کرنے والوں کو پسند کرتا ہے اور جو لوگ جب کوئی کھلا گناہ کر بیٹھیں یا اپنے ساتھ ظلم کر بیٹھیں تو وہ اللہ کو یاد کرتے ہیں اور اپنے گناہوں کی معافی چاہتے ہیں اور اللہ کے سوا کون گناہوں کو معاف کرنے والا ہے اور وہ اپنے کئے پر اڑتے نہیں اور وہ جانتے ہیں۔"

فاسق کا گناہ:

"فان تولوا فاعلم انما يريد الله ان يصيبهم ببعض ذنوبهم وان كثيرا من الناس لفاسقون" (المائده : ٤٩)

"اور اگر وہ نہ مانیں تو جان لو کہ اللہ یہی چاہتا ہے کہ ان کے بعض گناہوں پر انہیں سزا دے اور لوگوں میں سے اکثر فاسق ہیں۔"

ذنب اور سیئہ:

"ربنا اننا سمعنا منادیا ینادی للایمان ان آمنوا بربکم فامنا فاغفرلنا ذنوبنا وکفرعنا سیاتنا وتوفنا مع الابرار" (آل عمران: ۱۹۳)

"اے ہمارے رب! ہم نے سنا کہ ایک پکارنے والا پکارتا ہے ایمان کی طرف کہ تم اپنے رب پر ایمان لے آؤ، سو ہم ایمان لے آئے۔ پس ہمارے گناہ معاف کر دے اور ہماری سزائیں دور کر دے اور ہمیں نیک لوگوں کی موت دے۔"

بیضاوی کے بقول، ذنب اور سیئہ میں یہ فرق ہے کہ ذنب سے مراد کبیرہ گناہ ہیں اور سیئہ سے مراد صغیرہ گناہ۔ اس تفسیر کی قرآن کریم کی سورہ النساء آیت نمبر ۳۵ سے جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، بخوبی تائید ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ بہت صراحت کے ساتھ فرماتے ہیں کہ اگر تم ان کبائر سے اجتناب کرو جن کی ہم نے ممانعت کی ہے تو ہمارے تمہارے برے کاموں سے درگزر کریں گے۔ عین ممکن ہے کہ مفسرین کے ذہن میں یہ تعبیر اسی آیت سے آئی ہو۔

ذنب۔ خطیئہ:

"واستغفری لذنبک انک کنت من الخطئین" (یوسف)

"تو اپنے گناہ کے لیے معافی طلب کر بے شک تو ہی خطا کار تھی۔"

یہ الفاظ عزیز مصر نے اپنی بیوی سے کہے جس نے حضرت یوسف کو صحیح راستے سے ہٹانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ جو لوگ اس طرح کے ذنب کا ارتکاب کرتے ہیں انہیں خاطئین کہا گیا ہے۔ یہاں اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ ذنب اور خطا دونوں ایک دوسرے کے مترادف ہیں۔ خطیئہ پر ہم آگے چل کر بحث کریں گے۔

اثم: اس لفظ کے بنیادی معنی کے بارے میں علماءً نے مختلف آراً کا اظہار کیا ہے۔ مثلاً محیط المحیط میں اس کی یوں تعریف کی گئی ہے کہ یہ ممانعت کی خلاف ورزی کا نام ہے۔ یعنی ایسا کام کرنا جس کی اجازت نہیں ہے۔ مفسر البیضاوی لکھتے ہیں کہ اثم ایسا ذنب ہے جو سزا کے مستوجب ہے۔ (بیضاوی سورہ ۶۹ آیت ۱۲) دوسرے علماءً کے نزدیک اثم ایسے ممنوع کام کے کرنے کو کہتے ہیں جس میں نیت شامل ہو جبکہ ذنب ایسا کام ہے جس میں نیت کا شامل ہونا یا نہ ہونا دونوں مراد ہو سکتے ہیں۔ یہ اختلاف رائے خود اس بات کا ثبوت ہے کہ اس لفظ کی تعریف تقریباً ناممکن ہے۔ اس کے معنی بہت مبہم ہیں اور کسی حد تک نا قابل گرفت۔ چنانچہ ہم اس بحث میں اس لفظ کا صرف جائزہ لے سکتے ہیں کہ یہ مختلف سیاق و سباق میں کیسے استعمال ہوا ہے۔

قرآن کریم میں لفظ اثم کے استعمال کے بارے میں پہلی قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہ لفظ عام طور پر احکامی آیات میں مذکور ہے۔ مثلاً لین دین کے معاملات میں قرض کی صورت میں صحیح راستہ بیان کرتے ہوئے کہا گیا:

"ولاتکتموا الشهاده ومن یکتمها فانه آثم قلبه" (البقره : ۲۸۳)

"اور گواہی کو مت چھپاؤ جو شخص اسے چھپاتا ہے تو بے شک اس کا دل گنہ گار ہے۔"

اگلی آیت وصیت کے بارے میں قواعد سے تعلق رکھتی ہے۔

"فمن بدله بعد ماسمعه فانما اثمه علی الذین یبدلونه ان الله سمیع علیم فمن خاف من موص جنفاً او اثماً فاصلح بینهم فلا اثم علیه' ان الله غفور رحیم" (البقره : ۱۸۱۔۱۸۲)

"پھر جو کوئی (وصیت) سننے کے بعد اسے بدل ڈالے تو اس کا گناہ انہی پر

ہے جنہوں نے اسے بدل ڈالا۔ بے شک اللہ سننے والا' جاننے والا ہے۔ پھر جس کسی کو وصیت کرنے والے سے طرفداری کا خوف ہو یا گناہ کا ڈر ہو پھر وہ ان میں صلح کرا دے تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔ بے شک اللہ بڑا بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔"

اسی طرح ایک اور آیت میں جہاں ایسے لوگوں کی شرائط بیان کی گئی ہیں جو وصیت کے وقت قانونی گواہ بن سکتے ہیں' یہ واضح کیا گیا ہے کہ اگر وہ اپنی گواہی دیانت داری سے نہیں دیتے تو یہ اثم ہے۔ درج ذیل آیت میں حلف کے الفاظ بیان ہوئے ہیں جو گواہ قسم اٹھاتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ بے انصافی سے کام نہیں لے گا۔

"لانشتری به ثمنا ولوکان ذا قربی ولانکتم شهاده الله انا اذا لمن الآثمین" (المائده: ۱۰۶)

"ہم اس (قسم) کی قیمت نہیں لیں گے اگرچہ ہمیں کسی سے قرابت بھی ہو اور ہم اللہ کی گواہی نہیں چھپائیں گے کیونکہ تب تو بے شک گناہ گار ہوں گے۔"

اگلی آیت میں اپنی بیوی پر غلط الزام لگانے کے فعل کا ذکر ہے جس کا مقصد بیوی کو پہلے دی ہوئی دولت واپس لینا ہے۔ اس حکم کو بھی کھلا اثم قرار دیا گیا ہے۔

"وان اردتم استبدال زوج مکان زوج وآتیتم احداهن قنطارا فلا تاخذوا منه شیئا اتاخذونه بهتانا واثما مبینا" (النساء: ۲۰)

"اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی بدلنا چاہو اور تم ایک کو بہت سا مال دے چکے ہو تو اس میں سے کچھ بھی نہ لو۔ کیا تم بہتان اور صریح گناہ سے اسے لینا چاہتے ہو۔"

گواہی چھپانا بھی اثم ہے جیسا کہ ایک اور آیت میں ایک قطعاً مختلف صورت حال

بیان کرتے ہوئے کہا گیا۔

"والذين يوذون المومنين والمومنت بغير ما اكتسبوا فقد احتملوا بهتانا واثما مبينا" (الاحزاب :۵۸)

"جو لوگ مسلمان مردوں اور عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں جنہوں نے کوئی ایسا کام نہیں کیا تو انہوں نے بہتان کا اور صریح گناہ کا بوجھ اٹھایا۔"

اگلی آیت میں اثم سے مراد ناجائز طور پر دوسروں کی دولت کو ہڑپ کرنا ہے۔

"ولاتاكلوا اموالكم بينكم بالباطل وتدلوابها الى الحكام لتاكلوا فريقا من اموال الناس بالاثم وانتم تعلمون" (البقره :۱۸۸)

"آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق مت کھاؤ اور اس کو حاکموں تک نہ پہنچاؤ کہ تم لوگوں کے مال کا حصہ گناہ کے ساتھ کھا جاؤ جب کہ تمہیں معلوم بھی ہو۔"

اثم کے استعمال کے بارے میں دوسرا قابل ذکر نکتہ یہ ہے کہ یہ حرام کے تعلق سے بھی استعمال ہوا ہے۔ دوسرے الفاظ میں حرمت کی خلاف ورزی بھی اثم کہلاتی ہے۔ ان چیزوں کے ذکر کے بعد جن کا کھانا حرام ہے سور' خون اور اللہ کے سوا دوسروں کے نام پر قربان کی گئی اشیا' یہ آیت آتی ہے۔

"فن اضطر غير باغ ولاعاد فلا اثم عليه ان الله غفور رحيم" (البقره :۱۷۳)

"پھر جو کوئی مجبور ہو جائے لیکن نہ تو نافرمانی کرے نہ زیادتی تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔ بے شک اللہ تعالیٰ بڑا بخشنے والا اور نہایت مہربان ہے۔"

"يسئلونک عن الخمر والميسر قل فيهما اثم كبير ومنافع

للناس واثمهما اکبر من نفعهما" (البقره: ۲۱۹)

"تم سے شراب اور جوئے کے بارے میں پوچھتے ہیں کہہ دیجئے ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لئے فائدے بھی ہیں اور ان کا گناہ فائدے سے بڑا ہے۔"

تیسرے ہم دیکھ سکتے ہیں کہ لفظ اثم کا اطلاق کفر کی بعض صورتوں پر بھی کہا گیا ہے۔

"ولایحسبن الذین کفروا انما نملی لهم خیر لانفسهم انما نملی لهم لیزدادوا اثما ولهم عذاب مهین" (آل عمران ۱۷۸)

"اور کافر یہ نہ سمجھیں کہ ہم جو مہلت دیتے ہیں اس میں ان کی بھلائی ہے۔ ہم ان کو مہلت اس لیے دیتے ہیں کہ وہ گناہ میں بڑھتے جائیں اور ان کے لیے خوار کرنے والا عذاب ہے۔"

اسی طرح "اثم" کا تعلق شرک اور افتراء الکذب (جھوٹ) سے بھی ہے۔

"ومن یشرک بالله فقد افتری اثما عظیما" (النساء: ٤٨)

"جس نے اللہ کا شریک ٹھہرایا تو اس نے بہت بڑا گناہ افترا کیا۔"

"انظر کیف یفترون علی الله الکذب وکفی به اثما مبینا" (النساء: ٤٩)

"دیکھو اللہ پر کیسا جھوٹ باندھتے ہیں اور یہی کھلا گناہ کافی ہے۔"

اس ضمن میں یہ بات قابل غور ہے کہ دوزخ کے درخت زقوم کو جس کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ یہ دوزخ میں کافروں کی مخصوص غذا ہو گی' قرآن کریم میں اثیم (گناہگار) کا درخت بتلایا گیا۔ گویا اثیم (گناہگار) کا بالواسطہ معنی کافر کے سوا کوئی اور نہیں۔

"ان شجرہ الزقوم طعام الاثیم کالمھل یغلی فی البطون کغلی الحمیم" (الدخان: ۴۳-۴۶)

"یقیناً زقوم کا درخت گناہ گار کا کھانا ہے جسے پگھلا ہوا تانبا پیٹوں میں کھولتے ہوئے پانی کی طرح کھولتا ہے۔"

خطیئہ: ذیل کی آیت سے صریح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ خطیئہ کے بھی تقریباً وہی معنی ہیں جو اثم کے ہیں۔

"ومن یکسب خطیئہ او اثما ثم یرم بہ بر یئا فقد احتمل بھتانا واثما مبینا" (النساء: ۱۱۲)

"اور جو کوئی خطا یا گناہ کرے پھر کسی بے گناہ پر تہمت لگا دے تو اس نے بہتان اور بہت بڑا گناہ اپنے سر لے لیا۔"

حسب دستور مفسرین نے ان دونوں الفاظ کے درمیان فرق واضح کرنے کے کوشش کی ہے۔ مثلاً بیضاوی کے نزدیک خطیئہ صغیرہ گناہ ہے جو بلاارادہ سرزد ہو اور اثم کبیرہ گناہ ہے جو ارادتاً کیا گیا ہو۔ قرآن کریم کی لغات اس تفریق کی صریحاً تردید کرتی ہیں۔ قرآن کریم میں خطیئہ کا لفظ زیادہ تر شدید مذہبی گناہوں کے بارے میں استعمال ہوا ہے۔ مندرجہ ذیل آیت سے یہ نکتہ واضح ہوتا ہے۔

"قال نوح رب انھم عصونی واتبعوا من لم یزدہ مالہ وولدہ الاخسارا ومکروا مکرا کبارا وقالوا لاتذرن الھتکم ولاتذرن ودا ولاسواعا ولایغوث ویعوق ونسرا وقدا ضلوا کثیرا ولاتزد الظلمین الاضلالاً مما خطیئتھم اغرقوا فادخلوا نارا" (نوح: ۲۱-۲۵)

"حضرت نوح ؑ نے کہا: اے رب! ان لوگوں نے میرا کہا نہیں مانا اور

ایسے کا کہا مانا جس نے اس کے مال اور اولاد میں گھاٹے کے سوا کوئی فائدہ نہیں دیا۔ اور انہوں نے بہت بڑا داؤ کیا۔ اور انہوں نے کہا' اپنے معبودوں کو نہ چھوڑو اور ود' سواع' اور یعوق اور نسر کو نہ چھوڑو اور انہوں نے بہکا دیا۔ اور ظالموں کو گمراہی کے سوا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ ان میں سے کچھ اپنی خطا کی وجہ سے غرق کر دیئے گئے اور پھر آگ میں ڈال دیئے گئے۔"

اس آیت سے بہت ہی واضح طور پر اس لفظ کے معنی پتہ چلتے ہیں۔ اگلی آیت میں خاطی (یعنی جس سے خطا سرزد ہو) واضح طور پر لفظ کافر کے بدل کے طور پر استعمال ہوا ہے۔

"خذوه فغلوه ثم الجحيم صلوه ثم فی سلسله ذرعها سبعون ذرعا فاسلكوه انه كان لايومن بالله العظيم ولايحض على طعام المسكين فليس له اليوم ههنا حميم ولاطعام الامن غسلين لايا كله الا الخاطئون" (الحاقه : ٣٧،٣٠)

"اس کو پکڑو پھر اسے طوق ڈالو پھر اسے آگ کے ڈھیر میں ڈال دو۔ پھر ایک زنجیر میں جو ستر گز لمبی ہو اسے جکڑ دو۔ یہ وہ ہے جو اللہ پر جو بہت بڑا ہے' ایمان نہیں لاتا تھا اور مسکین کو کھانا کھلانے کی تاکید نہیں کرتا تھا۔ آج اس کا یہاں کوئی حمایتی نہیں۔ اس کا کھانا زخموں کے دھوون کے سوا کچھ نہیں۔ اس کو صرف خطا کار کھاتے ہیں۔"

ذیل میں ایک اور مثال سے واضح ہوتا ہے کہ خطا لازماً کفر کے اعمال کے لیے بولا گیا ہے۔

"وجاء فرعون ومن قبله والموتفكت بالخاطئه فعصوا

رسول ربهم فاخذهم اخذه رابيه" (الحاقه: ۹-۱۰)

"اور فرعون' اس سے پہلے لوگ اور الٹ دی جانے والی بستیاں خطائیں کرتے آئے۔ انہوں نے اپنے رب کے رسول کی نافرمانی کی' پھر اللہ نے ان کو سخت پکڑ سے پکڑلیا۔"

ایک اور آیت میں زمانہ جاہلیت کی اس رسم کو بھی خطا کہا گیا ہے جس کی رو سے لوگ غریبی کے ڈر سے اپنے بچوں کو قتل کر دیا کرتے تھے۔ اس کی مذمت کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:

"ولاتقتلوا اولادكم خشيه املاق نحن نرزقهم واياكم ان قتلهم كان خطاكبيرا" (بنی اسرائیل: ۳۱)

"اور اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو۔ انہیں اور تمہیں ہم ہی رزق دیتے ہیں۔ ان کا قتل بہت بڑی خطا ہے۔"

یہاں خطا کی جگہ دوسرے الفاظ مثلاً ذنب اور اثم بھی بہت آسانی سے استعمال ہو سکتے تھے اور ان سے معنی پر بھی کوئی فرق نہ پڑتا۔ اس ضمن میں یہ بات اہم ہے کہ ایک اور آیت میں ذنب اور خطا ساتھ ساتھ ایک ہی برائی کے فعل کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔ یہ آیت سورہ یوسف میں ہے اور یہاں گناہ سے مراد وہ سازش ہے جو حضرت یوسف کے بھائیوں نے ان کے خلاف کی تھی جب وہ بچے تھے اور اب اس پر پچھتا رہے تھے۔

"قالوا يآبانا استغفرلنا ذنوبنا انا كنا خطئين" (یوسف: ۹۷)

"وہ کہنے لگے' اے ہمارے باپ! ہمارے گناہوں کی ہمارے لیے معافی کی درخواست کر' بے شک ہم خطا کار تھے۔

ہم ایک اور مثال خطا اور سیئہ کے درمیان قریبی تعلق کے ثبوت کے طور پر پیش

کرتے ہیں۔

"وقالوا لن تمسنا النار الا ایا ما معدوده' قل اتخذتم عندالله عهدا فلن يخلف الله عهده ام تقولون على الله مالاتعلمون بلى من كسب سيئه واحاطت به خطيئه فاولئك اصحب النار هم فيها خلدون" (البقره: ۸۰۔۸۱)

"اور وہ کہتے ہیں کہ ہم کو آگ صرف چند گنے چنے دن لگے گی۔ کہہ دو کیا تم نے اللہ کے ہاں عہد لیا ہوا ہے کہ اب اپنے عہد کے خلاف نہیں کرے گا یا تم اللہ پر ایسا جھوٹ بول رہے ہو جو تم نہیں جانتے۔ کیوں نہیں جس نے گناہ کیا اور اس کی خطا نے اسے گھیر لیا تو وہ دوزخ میں جانے والے لوگ ہیں اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔"

جرم: جرم یقیناً ذنب کا ہم معنی ہے۔ قرآن کریم میں یہ لفظ اکثر اسم فاعل کے صیغے کے طور پر یعنی لفظ مجرم کے ساتھ آیا ہے۔ جس کا حتمی اشارہ بلا شک و شبہ کفر کی طرف ہے۔ مندرجہ ذیل آیات کے سرسری مطالعہ سے بھی یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے۔

تکذیب جرم ہے:

"فان كذبوك فقل ربكم ذو رحمه واسعه ولايرد باسه عن القوم المجرمين" (الانعام: ۱٤۷)

"اگر وہ تجھے جھٹلائیں تو کہہ دے کہ تمہارا رب بہت وسیع رحمت والا ہے اور اس کا عذاب مجرموں کی قوم سے ٹلنے والا نہیں۔"

استکبار جرم ہے:

"واما الذين كفروا افلم تكن آيتى تتلى عليكم فاستكبرتم

وکنتم قوما مجرمین" (الجاثیه : ۳۱)

"اور جن لوگوں نے انکار کیا کیا تمہارے سامنے میری آیات پڑھی نہیں جاتی تھیں پھر تم نے غرور کیا اور تم لوگ مجرمین کی قوم بن گئے۔"

"ان الذین کذبوا بآیتنا واستکبروا عنها لاتفتح لهم ابواب السماء ولایدخلون الجنه حتی یلج الجمل فی سم الخیاط وکذلک نجزی الظلمین" (الاعراف : ۴۰-۴۱)

"بے شک جن لوگوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور ان کے مقابلے میں تکبر کیا' ان کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے اور جب تک اونٹ سوئی کے ناکے میں نہ گھس جائے وہ جنت میں داخل نہ ہوں گے۔ ہم مجرمین کو یونہی بدلہ دیتے ہیں۔ ان کے لیے بچھونا اور اوڑھنا دوزخ ہے اور ہم ظالموں کو یونہی بدلہ دیتے ہیں۔"

مجرم لوگوں کا مومنین کے بارے میں تکبر کا جو خصوصی رویہ ہے ذیل کی آیت میں اس کی تصویر کشی بہت واضح طور پر کی گئی ہے۔

"ان الذین اجرموا کانوا من الذین آمنوا یضحکون واذا مروا بهم یتغا مزون واذا انقلبوا الی اهلهم انقلبوا فکهین واذا رأوهم قالوا ان هولاء لضالون" (المطففین : ۲۹-۳۲)

"بے شک وہ لوگ جنہوں نے جرم کیا وہ ایمان والوں پر ہنسا کرتے تھے جب ان کے پاس سے گزرتے تو آپس میں آنکھ مارتے اور جب لوٹ کر گھر جاتے تو پھر باتیں بنانے لگتے اور جب ان کو دیکھتے تو کہتے یقیناً یہ لوگ بھک گئے ہیں۔"

نفاق جرم ہے:

"لاتعتذروا قدکفرتم بعد ایمانکم ان نعف عن طائفه منکم تعذب طائفه بانهم کانوا مجرمین" (التوبه:٦٦)

"بہانے مت بناؤ تم نے ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کیا اگر ہم تم میں سے کچھ کو معاف بھی کر دیں تو بعض کو عذاب دیں گے کیونکہ وہ مجرم تھے۔"

افتراء الکذب جرم ہے:

"فمن اظلم ممن افتری علی الله کذبا اوکذب بآیته انه لایفلح المجرمون" (یونس:١٠)

"اس سے بڑا ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹا بہتان لگائے یا اس کی آیات کو جھٹلائے بے شک مجرم فلاح نہیں پاتے۔"

اسی طرح کی مثالیں کثرت سے دی جاسکتی ہیں لیکن فی الحال ہمارے مقصد کے لیے اتنی مثالیں کافی ہیں۔

حرج۔جناح: یہ دونوں الفاظ اثم کے قریب قریب ہم معنی ہیں اور اکثر قرآن کریم میں احکامی آیات میں استعمال ہوئے ہیں۔ بظاہر اس کا معنی وہ جرم یا گناہ ہے جو سزا کا مستوجب ہے۔

"لیس علیکم جناح ان تبتغوا فضلا من ربکم" (البقره: ١٩٨)

"اس میں تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم اپنے رب کا فضل تلاش کرو (یعنی ایام حج میں تم تجارت کے ذریعے منافع حاصل کر سکتے ہو)۔"

یہ بات کہ جناح اثم کے ہم معنی ہے اس طرح بھی ظاہر ہوتی ہے کہ اگلی چند آیات میں یہی لفظ یعنی اثم ایسے ہی سیاق میں جناح کی جگہ استعمال ہوا ہے۔

"واذکروا اللہ فی ایام معدودات فمن تعجل فی یومین فلا اثم علیه ومن تاخر فلا اثم علیه لمن اتقی" (البقرہ: ۲۰۳)

"گنتی کے چند دنوں میں اللہ کو یاد کرو پھر جو کوئی دو دن جلدی چلا گیا تو اس پر کوئی گناہ نہیں اور جو ٹھہر گیا تو جو ڈرتا ہے اس پر کوئی گناہ نہیں۔"

نکاح اور طلاق کے احکام کے ضمن میں لفظ جناح زیادہ کثرت سے استعمال ہوا ہے اس کے لیے مندرجہ ذیل دو مثالیں کافی ہیں۔

"ولا جناح علیکم فیما عرضتم به من خطبه النساء او اکننتم فی انفسکم" (البقرہ: ۲۳۵)

"اور تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم ان عورتوں کو اشارہ میں نکاح کا پیغام دو یا اپنے دل میں پوشیدہ رکھو۔"

"ترجی من تشاء منهن وتوی الیک من تشاء ومن ابتغیت ممن عزلت فلا جناح علیک" (الاحزاب: ۵۱)

"(اے محمدؐ!) تم ان میں سے جسے چاہو پیچھے رکھ دو اور جسے چاہو اپنے پاس جگہ دو۔ اور جنہیں تم نے ایک طرف کر دیا تھا ان میں سے، جس کو تم چاہو تم پر کوئی گناہ نہیں۔"

اگلی آیت میں ہنگامی ضرورت کے پیش نظر نماز کو قصر پڑھنے کا حکم ہے۔

"واذا ضربتم فی الارض فلیس علیکم جناح ان تقصروا من الصلوہ ان خفتم ان یفتنکم الذین کفروا" (النساء: ۱۰۱)

''اور جب تم ملک میں سفر کرو تو اگر تمہیں ڈر ہو کہ کافر تمہیں ستائیں گے تو تم پر کوئی گناہ نہیں اگر تم نماز کو کم کر لو۔''

"ليس على الضعفاء ولا على المرضى ولا على الذين لايجدون ماينفقون حرج اذا نصحو الله ورسوله" (التوبه :٩١)

''ضعیفوں' بیماروں اور ان لوگوں پر کوئی گناہ نہیں جن کے پاس خرچ کرنے کو کچھ نہیں جب وہ اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ دل سے صاف ہوں۔''

"زوجنكها لكى لايكون على المومنين حرج فى ازواج ادعيائهم اذا قضوا منهن وطرا وكان امر الله مفعولا ما كان على النبى من حرج فيما فرض الله له" (الاحزاب : ٣٨.٣٧)

''ہم نے اسے تمہارے نکاح میں دے دیا تاکہ مسلمانوں پر اپنے لے پالکوں کی بیویوں سے نکاح کرنا گناہ نہ رہے جب وہ ان سے اپنی غرض پوری کر چکیں اور اللہ کا حکم تو بجا لانے کے لیے ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے نبی پر جو فرض کر دیا ہے' اس میں کوئی حرج نہیں۔''

اس باب میں ہم نے قرآن کریم کی ان اہم ترین اصطلاحات پر بحث کی ہے جو معنی کے اعتبار سے ''اچھے'' یا ''برے'' کے مفہوم میں استعمال ہوئی ہیں۔ آیات کے قرآن کے تجزیے سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو گئی ہے کہ یہ دعویٰ بالکل غلط ہے کہ قرآن کریم میں ''اچھائی'' یا ''برائی'' کے منظم' کامل اور مطلق تصورات موجود نہیں۔

یہ صحیح ہے کہ ان میں سے بعض الفاظ کی درجہ بندی نہیں بلکہ توصیف بیان کرتے ہیں۔ مثلاً حرام' حلال اور رجس ایسے الفاظ ہیں جو صریحاً توصیفی ہیں۔ اگر وہ قدر بیان بھی

کرتے ہیں تو بالواسطہ بیانیہ انداز میں۔ اسی طرح فاحشہ اور فساد بھی بنیادی طور پر توصیفی ہیں۔ لیکن اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہم نے اس باب میں جن الفاظ سے بحث کی ہے ان میں سے بعض ایسے ہیں جو توصیف کے بجائے درجہ بندی بیان کرتے ہیں۔ صالح بڑی حد تک بیانیہ ہے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ درجہ بندی بھی کرتا ہے۔ سیئہ اور حسنہ جیسے الفاظ بیانیہ سے زیادہ درجہ بندی کرتے ہیں۔ باب کے آخر میں ہم نے جن الفاظ سے بحث کی ہے وہ تو یقیناً اخلاقی لغات کے دوسرے درجے سے تعلق رکھتے ہیں۔

اس سے قبل ہم نے ایک باب میں کفر اور ذنب کے موازنے کے ذریعے بھی اسی نکتے کی وضاحت کی تھی۔ کفر بہت واضح طور پر بیانیہ ہے جبکہ ذنب کا کام کفر کے معنوی مشتملات کی درجہ بندی کرنا ہے۔ تاکہ اسے قابل مذمت اور قابل سزا اعمال کا درجہ دے سکے۔

ہم نے شروع میں کہا تھا کہ قرآن کریم کے دینی اخلاقی تصورات کا نظام لسانی سطح پر زبان کے پہلے مرحلے کے عمل پر مبنی ہے۔ زبان کے دوسرے درجے میں انتہائی منظم شکل میں ان تصورات کی نشوونما جنہیں ہم "پانچ قانونی مدارج" کے نام سے جانتے ہیں' بعد کے فقہا کی کوششوں سے وجود میں آئی ہے۔ تاہم ہمیں یہ تسلیم کرنا ہو گا کہ خود قرآن کریم میں ایک اعلیٰ ڈھانچہ موجود ہے۔ اگرچہ یہ ڈھانچہ سادہ ہے لیکن اس میں دوسرے درجے کے اخلاقی تصورات کا ایک مربوط نظام موجود ہے۔